Year 2025; Vol 04 (Issue 01)

P. 86-94 https://journals.gscwu.edu.pk/

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

ڈاکٹر سمیرا اکبر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

Dr. Abdulaziz Malik

Assistant Professor, Department of Urdu, GC University, Faisalabad

Dr. Sumaira Akbar

Assistant Professor, Department of Urdu, GC University, Faisalabad

"مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو" میں ماضی کی بازیافت

Retrieving the Past in "Mujhy Apni Ankhon Mein Mehfooz Kar lo"

Abstract:

In Carlos Fuentes's Constancia, the retrieval of the past is a central theme, intertwining personal memory with historical consciousness. Characters grapple with elusive histories and lost loves, seeking to understand their present identities through fragments of what has been. The past isn't static; it actively shapes and haunts the present. Fuentes explores how individual and collective pasts—often suppressed or forgotten—are reconstructed, reinterpreted, and reclaimed. Dr. Whitby Hull's quest to understand his wife Constancia's enigmatic past embodies this struggle, highlighting how unearthing history is crucial for self-discovery and making sense of existence.

Key words: Novel, Latin America, Spain, Second World War, Literature, History, Existence, Individualism, Collectivism,

لاطینی امریکا کے خطے کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کو معرضِ تفہیم میں لانے کے لیے اسے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس خطے میں پہلے دور میں سپین، فرانس اور پرتگال نے نو آبادیاتی نظام قائم کیا اور کھل کر اس خطے کے وسائل اور ثقافت کو استحصال کا نشانہ بنایا۔ اسی لیے اس خطے کی تاریخ ،سیاسی بازی گری، خانہ جنگی اور استعماری طاقتوں کی باہمی چپقلش سے بھری پڑی ہے۔ مذکورہ خطے کی جغرافیائی حیثیت بھی کچھ اس طرح سے ہے کہ یہاں سیلاب، وبائیں اور قحط زندگی کا معمول ہے جس کے باعث عام آدمی کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ نو آباد کاروں نے اس خطے کے عوام کو، کھیتوں اور معدنیات کی کانوں میں مزدور کے طور پر کام کرنے پر مجبور کیے رکھا۔ ان کو مہذب بنانے کے لئے ہسپانوی زبان و ثقافت نافذ کی اور انھیں تاریخ سے کاٹ کر اپنی پسند کی تاریخ پڑھنے پر مجبور کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کی تاریخی ،سماجی اور ثقافتی شناخت کو مسخ کی جائے تا کہ بغاوت اور حقِ خود اختیاری کے عناصر کا اِحتمال کم سے کم ہو۔ اب اس خطے میں صرف سپینی اور پرتگالی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہاں کثیر ثقافتی سماج پروان چڑھا ہے۔ میکسیکو میں اس صورتِ حال کو بطورِ خاص محسوس کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کی سرحدیں امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک سے ملتی ہیں۔ یہاں کے باشندے دیگر لاطینی امریکی خطوں کی نسبت جلد جمہوری اقدار سے متعارف ہوئے اور انقلابی تحریکوں کی مدد سے انسانی حقوق کی جدوجہد شروع کی۔ اس صورتِ حال نے وہاں کے ادب پر بھی اثرات مرتسم کیے۔ مذکورہ خطے کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی صورتِ حال کے خمیر سے، مصنفین نے فکشن کو تحریر کرنے کے لیے جو غالب بیانیہ تشکیل دیا، اسے ادبی ناقدین جادوئی حقیقت نگاری سے موسوم کرتے ہیں۔ اس خطے کے حالات و واقعات اور سیاسی صورتِ حال کو یہاں کے فکشن نگاروں نے اس کامیابی سے فکشن کا حصہ بنایا ہے کہ اس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ لاطینی امریکی فکشن نگاروں میں کئی اہم نام ہیں جنھوں نے یہاں کی ثقافت، تاریخ اور سماجی صورتِ حال کو فکشن کے توسل سے پوری دنیا میں متعارف کرایا۔ ان فکشن نگاروں میں بورخیس، کورتازر، گارشیامارکیز، حوان رلفو اور ارنستو سباتو کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان میں سے ہی ایک نام کارلوس فوئنتس کا بھی ہے، جنھوں نے اس خطے کی تاریخ، ثقافت اور سیاسی صورتِ حال کو اپنی تحریروں کی مدد سے، پوری دنیا میں روشناس کرایا۔

کارلوس فوئنتس کا تعلق میکسیکو کی دھرتی سے ہے۔ وہ پاناما شہر میں 11 نومبر 1928ء کو پیدا ہوئے جہاں ان کے والد سفارت کار کی حیثیت سے مقیم تھے۔(1) ان کا بچپن سانتیاگو، بیونس آئرس اور واشنگٹن ڈی سی میں گزرا جس کے باعث ان شہروں کی ثقافتی اور سیاسی صورتِ حال کو انھوں نے قریب سے دیکھا۔ وہ جب وطن لوٹے تو انھیں الفانسو ریز جیسے دانشور کی صحبت حاصل

رہی جس نے ان کے ذہن کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ کارلوس فونیتس نے قانون کی ڈگری حاصل کی اور وزارتِ خارجہ میں ثقافتی اُمور کے شعبے سے وابستہ رہا۔ امریکا کی کئی یونیورسٹیوں میں تاریخ اور ادبیات پر لیکچرز دیے۔ نومبر 1987ء میں انھیں ہسپانوی زبان کے سروانتے ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔ اس انعام نے ان کی ادبی حیثیت کو مزید مستحکم بنایا اور ان کا شمار میکسیکو کے ان لکھاریوں میں ہونے لگا جنھوں نے ہسپانوی زبان کے ادبی سرمائے کو ثروت مند بنایا۔ فونیتس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری اور صحافتی تحریروں سے کیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "The Masked Days" کے عنوان سے شائع ہوا۔ انھوں نے "Aura" جیسے شاہکار ناول سے شہرت حاصل کی جو 1962ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس کے علاوہ Terra Nostra, اور The Death Of Artemio Cruz جیسے ناول بھی ان سے یادگار ہیں جو ان کے کہانی کہنے کے فن پر مہارت کے ثبوت ہیں۔ 1990ء میں ان کے طویل افسانوں کا مجموعہ "کونسٹنسیا اور کنواریوں کے لیے دوسری کہانیاں" شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سے کونسٹنسیا کی کہانی کو محمد عمر میمن نے "مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو" کے عنوان سے اردو روپ دیا ہے۔ یہ ترجمہ 2007ء میں شہرزاد، کراچی نے شائع کیا ہے۔

"مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو" دلچسپ اور حیران کن طویل افسانہ ہے جس کے تمام کردار ماضی کے واقعات میں گم رہتے ہیں۔ نقطۂ نظر کی پیشکش، کرداروں کے ارتقا اور کہانی کی فضا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے ناولٹ سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر غور کریں تو ناول میں مکمل زندگی پیش کی جاتی ہے جب کہ ناولٹ میں زندگی کے چند مخصوص اور منتخب پہلوؤں کو پیش کیا جاتا ہے۔ افسانے اور ناولٹ کا فرق، مہدی احمد رضوی نے کچھ یوں واضح کیا ہے:

> "مختصر افسانہ زندگی کا ایک تار ہے ناول زندگی کے تاروں کا ایک جال ہے اور ناولٹ میں چند تار بٹ کر موٹے تار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں"(2)

بغور دیکھیں تو ناولٹ کے انجام اور ناول کے انجام میں، فرق موجود ہوتا ہے۔ ناولٹ کا انجام مختصر افسانے کے انجام کے مانند ہوتا ہے۔ یعنی اس کے انجام میں وحدتِ تاثر کی وہی اہمیت ہے جو کہ مختصر افسانے میں ہوتی ہے۔ ناول میں واقعاتی نشیب و فراز کے کئی موڑ آتے ہیں لیکن ناولٹ میں واقعات بلندی کو چھو کو نشیب کا سفر اختیار کر لیتے ہیں ۔ یہاں تاثر کی وحدت اس قدر مستحکم ہوتی ہے کہ قارئین انجام پر کسی ذہنی انتشار یا تذبذب کا شکار نہیں ہوتے۔

مذکورہ کہانی کا راوی وٹ بی ہل جو پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے، اپنی محبوبہ کونسٹنسیا اور اس کے خاندان کی یادوں سے یوں جڑا ہوا ہے کہ قاری جو ناول کے شروع میں کونسٹینسیا کے ماضی سے بے خبر ہے اختتام تک اس کی پوری زندگی سے واقف ہو جاتا ہے۔ناول کے آغاز میں ہی مرکزی کردار وٹ بی ہل قاری کو ماضی کے سفر پر لے جاتا ہے جب وہ انکشاف کرتا ہے کہ وہ ہفتے کے تین دن اٹلانٹا میں گزارتا ہے اور باقی دن سوینا میں بسر کرتا ہے، جہاں وہ کونسٹنسیا کے ساتھ رہ رہا ہے۔ سوینا اور اٹلانٹا، یہ وہ شہر ہیں جہاں سیاہ فام کثرت سے آباد ہیں۔ اس کا ذکر ناول کے آغاز ہی میں وٹ بی ہل کچھ اس طرح کرتا ہے کہ قاری امریکا کی تاریخ کے اس عہد میں چلا جاتا ہے جب اس خطے کو آباد کرنے کے لیے افریقا سے سیاہ فاموں کو یہاں لایا جا رہا تھا۔اس حوالے سے ناول کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> "میں اس احساس کے ساتھ گھر لوٹتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ اب بھی وہی شہر ہے جو خود ہم نے تعمیر کیا تھا(ان تجارتی دھاوں کے باوجود جن کا ذکر کر چکا ہوں) جہاں ہم نے اس کی تعمیر میں مدد پہنچانے کے لیے، ان پناہ گزینوں کو ان کی مرضی کے خلاف حاصل کیا، وہ کالے لوگ جو اپنی مرضی سے افریقا سے فرار نہیں ہوئے تھے(اگر پناہ گزین کے بارے میں اس طرح کی گفتگو کی جا سکے تو) بلکہ زنجیر بکف، کھینچ کھانچ کر اپنے برِ اعظم سے باہر لائے گئے تھے۔۔۔میں، جو اب بوڑھا اور مائل بہ خواب ہوں، اپنے سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم نے، انتہائے کار، اپنے جرم کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔"(3)

نینسی آئزن برگ نے اپنی کتاب White Trash میں لکھا ہے کہ بے روز گاروں اور مزدوروں کو امریکا میں لایا گیا اور ان سے یہ معاہدہ کیا گیا کہ وہ پانچ سال تک بغیر معاوضے کے کام کریں گے۔ اس کے بعد انھیں کہیں سے زمین کا ایک ٹکڑا دیا جاتا تھا کہ وہ اس پر کاشت کاری کر لیں۔ جب زمین کے مالکان کو اندازہ ہوا کہ افریقی غلاموں سے کام لینے میں زیادہ منافع ہے تو انھوں نے افریقی غلاموں کی بڑی تعداد کو امریکا میں بر آمد کر لیا۔ امریکا میں آزادی کے بعد جو نیا دستور تشکیل دیا گیا اس میں غلاموں کے لیے کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ امریکا کے دستور اور اس کی جمہوریت میں غلاموں کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک اور ان کو ووٹ کے حق سے محروم رکھنا، واضح تضاد موجود رہا ہے۔ افریقی نسل کو بنیادی حقوق کے حصول کے لیے 1960 تک انتظار کرنا پڑا۔ لیکن ابھی تک ان غلاموں کے حوالے سے امریکا میں نسلی تعصب موجود ہے، جس کی جانب کارلوس فونیتس ناول کے ابتدائی صفحات میں ہی اشارہ کر رہے ہیں۔ڈاکٹر وٹلی برے ہل کا ماضی اتنا سادہ نہیں، اس نے زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔

ناول کا ایک اور کردار موسیو پلاتنیکوف بھی ماضی سے جُڑ کر زندگی کے دن گزار رہا ہے جو روس سے امریکا ہجرت کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ وہ روس میں تھیٹر کا اداکار تھا، حالاں کہ وہ سیٹ ڈیزائنر بننے کا خواہش مند تھا۔ اسے روس میں سٹالن کے دورِ حکومت میں ہجرت کے عذاب سے گزرنا پڑا۔ لینن کی وفات کے بعد روس میں سٹالن نے زمامِ اقتدار سنبھالی تو اشتراکی نظام میں بیوروکریٹک رویے شامل کر دیے جس کے باعث اشتراکی جمہوریت، آمریت میں بدل گئی۔ یہ وہ دور تھا جس میں ٹراٹسکی جیسے دانشور کو بھی سٹالن پر تنقید کرنے کی پاداش میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ سٹالن اتنا سخت گیر ثابت ہوا کہ اس کے خلاف ڈی سٹالنائزیشن موومنٹ چل نکلی۔ فرینکفرٹ سکول کے تقریباً تمام سماجی ماہرین نے سٹالن کے بیوروکریٹک نظام کی نفی کی (4) پلاتنیکوف اس صورتِ حال کو ناول میں یوں بیان کرتا ہے:

> "کیا اس کو حراست میں لینے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے، ماسکو کے ایک جیل خانے میں گھسیٹ کر لے جانے کی، اور وہاں بغیر عدالتی کارروائی کے، 2 فروری 1940 کو، گولی مار دینے کی، ایک تاریخ جو، ڈاکٹر ہل، میں کبھی نہیں بھولوں گا؟ میں تم سے پھر پوچھتا ہوں: کیا یہ مایر ہولڈ کو مار ڈالنے کی ایک وجہ ہو سکتی ہے، یہی کہ وہ ایسے فنی نظریے کو قبول کرنے کا منکر تھا جس نے اسے فن کی تخلیق سے باز رکھا ہوتا؟" (5)

پلاتنیکوف کے کردار کے توسط سے کارلوس فوئنتیس نے ماضی کو کریدنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے اس کردار کے خمیر میں جلاوطنی اور ماضی سے منقطع ہو جانے کا احساس شدت سے موجود ہے، ان عناصر نے اُس میں تنہائی اور اجنبیت کو پیدا کیا ہے۔ یہ ایسے دانشوروں کا نمایندہ کردار بن کر سامنے آیا ہے جو اپنی تاریخ، ثقافت اور شناخت کے ساتھ ایک طرح کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کردار نے کہانی میں تاریخی کرداروں اور ذاتی یادداشتوں کے درمیان ایک تعلق قائم کیا ہے جس کی مدد سے مصنف نے روس، سپین اور امریکا کی تاریخی اور سیاسی صورتِ حال میں جھانکنے کی کاوش کی ہے۔

کونسٹنسیا، کہانی کا ایسا کردار ہے جو قاری کو ناول سے جوڑے رکھتا ہے۔ اس کردار کی پُراسراریت سے پردہ کشائی قاری کو حال سے ماضی کا سفر طے کراتی ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ ایک پیچیدہ اور کثیر الجہت کردار ہے تو بے جا نہ ہو گا کیوں کہ کہانی کے بنیادی موضوعات جیسے شناخت، یادداشت، محبت، وفا، بقا و فنا اور ثقافتوں کے مابین تصادم کو اپنی ذات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ کونسٹنسیا کی زندگی کا بیشتر حصہ اپنی شناخت کی تلاش، اپنے ماضی، خاندان اور اپنی ہسپانوی وراثت سے تعلق قائم کرنے میں گزرتا ہے۔ اس کے نام کا لفظی مطلب بھی ثابت قدمی اور استقامت ہے جو اس کی جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم پہ

دلالت کرتا ہے۔ وہ سپین کی ثقافت اور تاریخ سے محبت کی مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ برسوں امریکا میں زندگی بسر کرنے کے باوجود، انگریزی زبان سیکھنے سے گریز کرتی ہے۔ اس حوالے سے اقتباس دیکھیے:

> ”وہ ہمیشہ ایک جیسی ہی رہی تھی۔ یا یہ کہنا بہتر ہو گا کہ وہ اب بھی پہلے جیسی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ گھر داری کرتی، ہمیشہ اس بات کی شاکی کہ ریاستہائے متحدہ میں اچھے خدمتگاروں کا کال پڑا ہوا ہے، لیکن خانہ داری میں ہاتھ بٹانے کے لیے کسی اچھے ملازم کی تلاش کی کوشش سے بھی محترز، وہ میرے سوا کسی سے ملتی جلتی نہیں تھی، چنانچہ وہ انگریزی نہیں بولتی تھی (اور کبھی سیکھنا بھی نہیں چاہا تھا) وہ ٹیلی ویژن کے بٹن دباتی، لیکن کوئی بھی پروگرام دیر تک نہ دیکھتی؛ عشائے ربانی کی تقریبات میں شریک ہوتی، رات کو عبادت کرتی،۔۔۔۔"(6)

زبان کسی ملک یا قوم کی شناخت ہوتی ہے۔ ایک قوم کا دوسری قوم سے امتیاز اسی بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ ان میں ثقافتی، مذہبی اور لسانی افتراق موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی کے مذکورہ کردار کے لیے، اس کی مادری زبان اور آبائی ملک کی ثقافت حساس معاملہ ہے۔ وہ زندگی کے ہر معاملے پر سمجھوتہ کرنے کو تیار ہے لیکن اپنے مذہب، ثقافت اور زبان پر سمجھوتہ نہیں کرتی۔ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں بلکہ پیچیدہ ہے۔ کیوں کہ دنیا کی تاریخ میں کئی جنگیں، صرف اپنی قومی شناخت کو برقرار رکھنے کے لئے وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ کئی ممالک اپنے وسائل کا خاطر خواہ حصہ قومی شناخت اور قومی زبان کے تحفظ پر خرچ کر دیتے ہیں تا کہ قوم کے افراد میں اپنی زمین اور زبان سے محبت قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کونسٹنسیا نے سپین میں خانہ جنگی اور سیاسی انتشار کے باعث سپین کو تو چھوڑ دیا لیکن اس نے اپنی زمین اور زبان سے محبت کو نہیں چھوڑا۔ جس دن اس نے ایسا کیا اس کی شناخت ختم ہو جائے گی اور اس کی شناخت کا خاتمہ اس کے وجود کا خاتمہ ہو گا۔

اسی طرح مذہب سے جُڑے رہنا بھی کونسٹنسیا کے شعور اور لاشعور کا حصہ ہے۔ وہ باقاعدگی سے عبادت کے دن گرجا جاتی ہے۔ مذہبی رسومات میں شرکت کرتی ہے کیوں کہ مذہب، ثقافت کا وہ حصہ ہے جو افراد کی ذہنی اور نفسی تشکیل کرتا ہے جس سے باہر نکلنا یا اس کی حدود کو توڑنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ مذہب اور ثقافت، ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے ایک دوسرے پر اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں۔ کونسٹنسیا اپنے مذہب سے جذباتی اور روحانی تعلق رکھتی ہے اور اسی مناسبت سے وہ ماحول میں موجود اشیا کو معنی دیتی ہے۔ وہ سپین سے ہجرت کر کے جب سوینا آتی ہے تو اپنے ساتھ گھٹنے ٹیکنے کی چوکی اور مریم کے مجسمے کے سوا کچھ بھی نہیں لاتی:

وہ چالیس سال پہلے مال بردار بحری جہاز میں سیویناوارد ہوئی اور تب سے اب تک شہر سے باہر قدم نہیں دھرا ہے۔ وہ اپنے ساتھ صرف دعا کے وقت گھٹنے ٹیکنے کی چوکی اور مگرینا کی شبیہہ لائی تھی، نہ کسی قسم کا فرنیچر، نہ کوئی فوٹو، نہ ایک کتاب، گو اس کے صندوق میں گہری رنگت کے کپڑے، متعدد مذہبی تصاویر اور کنواری مریم کے لیے دعائیں ضرور تھیں۔"(7)

اس کی مذہبی اور ثقافتی اقدار نے اسے دیگر خواتین کی نسبت منفرد بنایا ہے جس کے باعث کہانی کا راوی اسے پسند کرنا شروع کرتا ہے۔ راوی کا تعلق امریکا کی سرزمین سے ہے اسی لیے وہ خود کو ثقافتی اور سماجی اعتبار سے برتر سمجھتا ہے۔ دنیا میں جتنے ممالک نے بھی دیگر اقوام پر اپنا تسلط قائم کیا ہے وہاں اس نظریے کو رائج کرنے کی کوشش کی ہے کہ طاقتور اقوام مہذب ہیں اور محکوم اقوام وحشی اور غیر مہذب ہیں۔ اب ان اقوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان اقوام کو مہذب بنائیں۔ نو آبادیات اسی کا نتیجہ تھی اوراب اس کی شکل استعماریت کی ہے۔ حاکم اور محکوم کی تہذیبوں کے تصادم کا اظہار کارلوس فونیتس نے کہانی میں مرکزی کردار ڈاکٹر روٹ بی ہل سے یوں بیان کرایا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ میری اندلسی گلتیا تھی۔ میں اس کا ڈھالنے والا تھا؛ بڑے جوش میں آکر، میں نے خود کو تہذیب کا گماشتہ محسوس کیا، روحانی اقدار کا حامل، جو خوشحالی سے متصادم نہیں تھیں، اشیا کے عملی پہلو سے۔ مجھے اپنے اوپر یقین تھا، اپنے ملک پر، اپنی روایات پر، اپنی زبان پر، اور اسی لیے مجھے اتنا یقین تھا کہ میں اس اُمّی لڑکی کی کایا پوری طرح پلٹ سکتا ہوں، جو انگریزی بولنا بالکل نہیں جانتی: میں نے فیصلہ کیا۔۔۔ ہینری جیمس کی روح کو سلام کرتے ہوئے۔۔۔ کہ از راہِ تغیر وہ پگ میلین اس بار ایک امریکی ہوگا، جو یورپی گلتیا میں روح پھونکے گا، جسے دریائے وادی الکبیر کے کنارے بے گھر کیا گیا تھا جو یورپ کی قدیم ترین سرزمین تھی:"(8)

ڈاکٹر روٹ بی ہل چاہنے کے باوجود اس کونسٹنسیا کی کایا کلپ نہیں کر پایا۔ اس نے نہ اپنی ثقافت سے روگردانی کی، نہ انگریزی زبان سیکھی اور نہ ہی اپنے مذہب کو خیر باد کہا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ثقافت اور زبان سے جڑت اتنی مضبوط تھی کہ جیسے جسم اور روح کا انسلاک ہو۔ روح کے خاتمے سے جسم مردہ ہو جاتا ہے، بالکل ایسے ہی انسان اپنی تہذیب اور ثقافت سے ناتا توڑ کر شناختی وجود کو موت کے حوالے کر دیتا ہے۔

کارلوس فونیتس کے کردار سپین کی خانہ جنگی کے منفی اثرات کا شکار ہیں۔ یہ خانہ جنگی جو 1936 سے 1939 تک جاری رہی اس نے عام آدمی پر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ یہ جنگ ریپبلکن حکومت اور قوم پرستوں

کے مابین لڑی گئی۔ قوم پرستوں کے قیادت جنرل فرانسسکو فرانکو کے پاس تھی۔ قوم پرستوں کی فتح کے بعد سپین میں کئی دہائیوں تک آمریت قائم رہی جس اثرات وہاں کے عوام نے برداشت کیے۔ دائیں بازو کی اس آمریت کا خاتمہ 1975ء میں جنرل فرانسسکو فرانکو کی موت کے ساتھ ہوا۔ اس خانہ جنگی میں لاکھوں افراد بے گھر، ہلاک اور زخمی ہوئے۔ بڑی تعداد نے سپین سے بھاگ کر فرانس اور لاطینی امریکا میں پناہ لی۔ اس ساری صورتِ حال نے سپین کے سماجی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا۔ کئی نامور سیاسی دانشور، ادیب، فنکار اور شاعر جو بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے، جلاوطن ہونے پر مجبور ہوئے، جس کے باعث سپین کی ثقافتی صورتِ حال بھی دگر گوں ہو کر رہ گئی۔(9)

"مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو" کا مرکزی کردار کونسٹنسیا کے ماضی کی تلاش میں جب سپین کے شہر سِوِلّ جاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ کونسٹنسیا کیا تھی اور اس نے ملکی خانہ جنگی میں کیا کیا کچھ قربان کیا تھا۔ اس لمحے قاری پر سِوِلّ اور سیوینا کے شہروں کا تقابل ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ایک شہر نئی دنیا کا نمایندہ بن کر سامنے آتا ہے جب کہ دوسرا شہر قدیم دور کی یاد دلاتا ہے۔ دونوں شہر ہی اس کردار کو بھول بھلیوں میں ڈالے ہوئے ہیں اور وہ ان میں بے سمت کسی راستے کا متلاشی ہے۔ وہ یہ تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے کہ کونسٹینسیا کا خاندان واقعی خانہ جنگی میں مارا گیا تھا یا جو لوگ چھپے ہوئے تھے سرکار نے انھیں سرکاری طور پر مردہ قرار دے دیا تھا۔

کارلوس فونیتس کو میکسیکو کے اہم فکشن نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے کام میں ماضی، تاریخ، انسانی یادداشت اور شناخت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کہانی میں بھی کارلوس کے کردار ذاتی یادوں اور تاریخ کے واقعات کے درمیان ہچکولے کھاتے نظر آتے ہیں۔ ماضی صرف گزرا ہوا زمانہ نہیں ہوتا بلکہ افراد کے حال کی تشکیل میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ فرد کی شناخت قائم کرنے میں کردار ادا کرتا ہے۔ مذکورہ کہانی میں فونیتس نے لاطینی امریکا، سپین کی خانہ جنگی، مختلف خطوں کے ثقافتی تضادات اور استعماری ماضی کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے تاریخ کے مروجہ بیانیے کے متن سے ان واقعات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو دبا یا بھلا دیے گئے تھے۔ انھوں نے کرداروں کی حرکات و سکنات سے ثابت کیا ہے کہ ماضی جامد شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک متحرک حقیقت ہے جسے حال کے آئینے میں از سرِ نو بیان کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1. Encyclopedia Of Postcolonial Studies, Sangeeta Ray, John Wily and Sons,2016

"مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو" کے دیباچے میں محمد عمر میمن نے ان کی تاریخِ پیدائش 1927 درج کی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا میں بھی 11 نومبر 1928 درج ہے، اس لیے 1928 کو ہی درست خیال کیا جائے گا۔

2. مہدی احمد رضوی، "اردو ناولٹ نگاری، فن اور ارتقاء"، (مظفر پور: کتابستان، چندوارہ، 2004ء)، ص 81
3. کارلوس فونیتس، "مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو"، مترجم: محمد عمر میمن، (کراچی: شہر زاد، 2009ء)، ص 17
4. زبیر رانا، "کیا مارکسزم ناکام ہو گیا؟"، (لاہور: جنگ پبلشرز، 1991ء)، ص 20
5. کارلوس فونیتس، "مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو"، ص 63
6. ایضاً، ص 48
7. ایضاً، ص 57
8. ایضاً، ص 73
9. اس ساری صورتِ حال کو Hugh Thomas نے اپنی کتاب Spanish Civil War میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ Antony Beevar کی کتاب The Battle For Spain: The Spanish Civil War(1936-1939) بھی خانہ جنگی کے حالات اور اس کے اثرات کو سمجھنے میں مدد گار ثابت ہو سکتی ہے۔ ارنسٹ ہمنگوے کا ناول "For Whom The Bell Toll" کا موضوع بھی سپین کی خانہ جنگی ہے جس میں اس نے انسانوں پر جنگ کے اثرات کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔